سلسلہ اشاعت امامیہ مشن، لکھنؤ نمبر ۶۹

نظامِ تمدن اور اسلام

(از)

سرکار سید العلماء الحاج مولانا السید علی نقی النقوی دام ظلہ
مجتہد العصر

مطبوعہ:- سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۷۴ء

قیمت:- ۲۵ پیسے

تعارف

یہ سرکار سید العلماء دام ظلہ کا وہ مقالہ ہے جو مجدوح نے ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء کو اسلام اِن دی ماڈرن ایج نئی دہلی کی کانفرنس میں پڑھا تھا۔

یقین ہے کہ افراد دینی اس رسالہ کو بھی کثیر سے کثیر تعداد طلب فرما کر برادران وطن میں مفت تقسیم فرما کر عند اللہ و عند الرسولؐ ماجور ہوں گے۔

خادم ملت
سید ابن حسین نقوی عفی عنہ
آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

محرم الحرام سنہ ۱۳۹۴ھ
فروری سنہ ۱۹۷۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمدّن کی بناء احساسِ اجتماعیت پر ہے اور اجتماعیت کی اساس الفت و محبت پر قائم ہے۔

فطری طور پر انسان کو اصل محبوب خود اپنی ذات ہے، اس لئے کہ وہی اُس سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ پھر اپنی ذات کو مرکز بنا کر اضافتوں کے خطوط چلتے ہیں اور وہ باعث محبت بنتے ہیں تو سب سے چھوٹا خط ماں باپ سے اتصال پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے کہ اُن کا رشتہ اس سے بلاواسطہ ہے تو محبت میں بھی اُن کا پہلا حصہ ہوتا ہے۔ پھر جب اولاد ہوتی ہے تو بالکل اتنا ہی چھوٹا خط اس کے اور اس کی صلبی و بطنی اولاد سے رشتہ کا ہوتا ہے، اس لئے ان کا بھی درجہ محبت کا وہی ہوتا ہے۔

اسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار احکام میراث کے بیان میں

ماں باپ اور اولاد کے حصہ کا تذکرہ کر کے قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے کہ:-

آباؤکم وابناؤکم لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعا	تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد یہ دو ایسے ہیں کہ ان میں تم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ان میں کون زیادہ قریب ہے اور کون کم ہے۔[2]

پھر اس کے بعد ماں باپ کے واسطہ اور پھر واسطہ در واسطہ سے نسبت رکھنے والے عزیزوں کی رشتہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ یہ میرے بھائی بہن ہیں، وہ میرے دادا دادی، نانا نانی ہیں۔ پھر یہ میرے چچا اور وہ ماموں ہیں اور اس کے بعد چچازاد بھائی اور ماموں زاد بھائی اور اس سے آگے وہ ہماری برادری کے ہیں۔

یہ سب خطوط محبت جو اپنی ذات کے رشتہ سے آگے بڑھتے ہیں جتنا دور ہوتے جاتے ہیں، اپنا اثر کھوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اتنا فاصلہ ہو جاتا ہے کہ محبت کا کوئی جذبہ اور رشتہ کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا۔

ہاں اپنی ذات سے کچھ خطوط انسانوں کے علاوہ دوسری چیزوں سے بھی وابستہ کرتے ہیں مثلاً میرا گھر، میرا اسکول اور ایسے ہی آخر میں میرا وطن۔

تو اب کچھ محبت کے جذبات ان رشتوں سے چلتے ہیں۔ گھر

کے رشتہ سے پڑوسی۔ اسکول کے رشتہ سے کلاس فیلو اور وطن کے رشتہ سے ہم وطن مگر چونکہ ان میں سے ہر چیز محدود ہے لہذا اُس کے ذریعہ میرے، میرے میرے کی اضافت کے ساتھ محبت پیدا ہوتی ہے اُس کا اثر تھوڑی تھوڑی دور تک جاتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے اور پھر اسی "مین" کے توسط سے نفرتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ "میرا دشمن"، "میرا مخالف"، "میری قوم کا دشمن"، "میرے خاندان کا حریف" وغیرہ ——
لہذا اس "میں" والی رشتہ داری کے زیر سایہ جس تمدن کی عمارت قائم ہوگی، اُس میں اپنے پرائے، دوست دشمن اور عزیز غیر کی تفریق لازمی ہے۔

اس نظام تمدن کے آغوش میں تربیت یافتہ اور اسما ذہنیت کی حامل کوئی فرد جب کسی بھی اقتدار کی حامل ہوگی تو لازماً اقربا پروری، دوست پروری اور آج کل کی وضع کے مطابق اپنی پارٹی کے افراد کی پرورش بطور ایک واجب الادا حق یا ایک لازمی تقاضائے فطرت کے طور پر عمل میں آئے گی جس کے نمونے ہر دور میں ساری آنکھوں یا تاریخ کی عینک سے بیشمار نظر آئینگے یہ اُسی تمدنی رجحان کا ایک کرشمہ ہے جو "انا" کو مرکز میلانات قرار دینے سے قائم ہوتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے، اس لئے وہ بھی انسان سے اُس

کی ذات کو الگ تو نہیں کرسکتا۔ کوئی شک نہیں کہ اپنے سے قریب ترین اپنی ذات ہے لہٰذا محبّت ذات کو کسی صورت سے بھی ختم کرنا ممکن نہیں ہے لیکن اُس وقت کا ذکر نہیں کہ جب زمانہ، طفولیت ہے اور ابھی شعورِ انسانی بیدار نہیں ہوا۔ یہ دور تو دین کی عملداری سے خارج ہے جسے شریعت کی زبان میں یوں کہا جاتا ہے کہ تکلیف ساقط ہے لیکن ادھر انسان بلوغ ورشد کی منزل پر پہونچا یعنی قوائے جسمانی کے کمال کے ساتھ شعور و اختیار کی طاقت مکمل ہوئی اب اسلام انسان کے زاویہ نگاہ کو بدلتا ہے۔

مادّی ماحول کے مطابق اپنی ذات سے خطوط جو کھنچ رہے تھے وہ چار طرف یعنی پس پیش، راست وچپ جارہے تھے اور چونکہ خود اپنی ذات قیود زمان ومکان میں اسیر ہونے کے لحاظ سے محدود ہے اور پھر وہ خط جس جس تک جارہے تھے، وہ بھی محدود لہٰذا محبت کا دائرہ پھیلنے کے ساتھ بھی آخر میں تنگ ہی ہوجاتا تھا اور ایک مقام ایسا آتا جہاں یہ خط پھر آگے بڑھتا ہی نہ تھا یعنی اپنی ذات سے خط باپ سے اُس کے باپ یعنی دادا تک یا اُس کے بیٹے یعنی اپنے بھائی تک گیا تو نسبۃً کمزور پڑگیا اور دادا سے اُس کے باپ یعنی پردادا تک گیا یا اُس کے بیٹے یعنی اپنے چچا تک

پہونچا تو ضعیف تر ہوگیا، یہاں تک کہ پانچ پشت تک جاکر احساس قرابت ختم ہوگیا۔

ایسے ہی مکان سے محبت ہوئی تو مکان کے پاس والے ہمسایہ سے الفت ہوئی اور اس کے بعد والے مکان میں رہنے والے کے ساتھ ہمسائیگی کا احساس کمزور ہوا اور دس بیس یا تیس چالیس مکانوں کے بعد کوئی تصور ہمسائیگی کا قطعاً باقی نہیں رہا۔ یہ اس لئے کہ مرکز خط محبت کا محدود تو احساس الفت بھی محدود اور محبت و قرابت کی بنا پر حقوق کا جو تصور ہوگا وہ بھی محدود ہوگا۔

اسلام کی دعوت انسانی شعور کے بیدار ہونے کے بعد یہ ہے کہ تم اُدھر اُدھر کے خطوط کے علاوہ جو پیدائش کے وقت سے نکل رہے تھے، اب ایک خط اپنی ذات سے کھینچو فوق کی طرف یعنی ابھی تک جو رشتے سمجھتے تھے، وہ اپنے باپ اپنی ماں یا اپنے گھر، اپنے دیش وغیرہ کی طرف۔ اب اپنی ذات کے تصور کے ساتھ اُس رشتہ کو سوچو اور سمجھو جو تمھارا تمھارے پیدا کرنے والے کے ساتھ ہے۔ یہ خط بھی ویسا ہی بلاواسطہ ہے جیسے ماں باپ اور اپنی اولاد کی طرف بلاواسطہ خطوط تھے۔ ویسے ہی یہ خط ہے جو اپنے خالق کے ساتھ، اپنے مالک کے ساتھ اور اپنے رب کے ساتھ ہے۔ یعنی وہ خط جو انسان

کو اللہ سے ملاتا ہے۔

اب اللہ چونکہ مرکز جمال و جلال ہے۔ اُس کے جمالی اوصاف کے سامنے ہر جاذب نگاہ جلوہ اور اُس کے جلال کے سامنے ہر ہیبت و سطوت ہیچ ہے اور اسی لیے ابتدائے آفرینش سے یہ مشاہدات رہے ہیں کہ جن کی نظر اللہ پر ہو گئی اُن کے دل کو کوئی حسن بھا نہیں سکا اور اُن کے سر کو کوئی طاقت و جبروت کا مظاہرہ جھکا نہیں سکا۔

اس لیے یہاں پہونچ کر اگر انسان کی نگاہ اُس کے کمال لامحدود میں مستغرق ہو گئی تو اسے اب خلق سے کوئی تعلق محسوس ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ رہبانیت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے تحت میں ایسی سیرت کی مثالیں سامنے آئیں گی کہ بیٹے کے سامنے ماں اپنی شفقت بے قرار کے ذوق و شوق میں آتی ہے اور بیٹا کہہ دیتا ہے کہ میں تمھیں نہیں پہچانتا تم کون ہو۔ یا انتہائی خوبصورت جوان بیوی جس سے شادی کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے خوابگاہ میں سوتی رہ جاتی ہے اور شوہر جنگلوں کی راہ لیتا ہے، اس طرح کہ پھر اُس بیوی کو اُس کی صورت نظر نہیں آتی۔

اس صورت میں ہر فرد اپنی معرفت کی تنگنا میں اسیر ہو کر ایک مستقل وجود بن گئی اور ایسے کمزور در کمزور افراد کے اجتماع سے کسی نظام تمدن کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح وہ تمدن

بے مقابل رہا جس کی بنیاد مادیت پہ ہے اور جس کے تقاضے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

تمام دنیائے مذاہب میں اسلام اور اُس کی شریعت نے جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ سے خلق تک پہونچی، یہ کام انجام دیا اپنی ذات سے رشتہ کا خط اللہ تک پہونچا کر صرف اُس کے کمالاتِ ذات تک نظر کو محدود نہیں رکھا بلکہ بلا توقف، بغیر کسی تاخیر کے اُس کے اُس رشتہ کو یاد دلایا جو اُس کا اُس کے مخلوقات کے ساتھ ہے۔

اس لئے قرآن کے اُس سورہ میں جو نماز کا لازمی جزء ہے اور ہر نماز میں ایک دفعہ نہیں بلکہ کم از کم دو دفعہ اُس کا پڑھنا ضروری ہے اور روزمرہ کی نمازوں کے علاوہ دوسرے واجب اقسام نماز جیسے نماز جمعہ، نماز عید الفطر و عید الاضحیٰ اور یہاں تک کہ نماز آیات میں بھی اُس کا مکمل پڑھنا لازم ہے اور پھر نوافل جن کے روزمرہ پڑھنے کی تاکید رہے اور دوسری سنتی نمازیں جو لاتعداد ہیں، ان سب میں ہر نماز میں اُس کی تکرار لازمی ہے۔ اس طرح ایک مسلمان کی زندگی میں کتنی دفعہ اسے زبان سے خود ادا کرنا ہوتا ہے اور دوسرے کسی بھی مسلمان کے باآواز نماز پڑھتے وقت اُس کی زبان سے لاتعداد مرتبہ سننا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں اسم ذات

کے بعد علم، قدرت، حیات، ارادہ وغیرہ، اُس کے صفاتِ ثبوتیہ اور ان کے علاوہ صفاتِ سلبیہ جو ہر مسلمان کے عقائد کا جزء ہیں اُن میں سے کسی کو اس سورہ کا صراحتہً جزء نہیں بنایا گیا بلکہ ان تمام صفاتِ جلال و جمال کو صرف لفظ "اللہ" میں مضمر بنا کر جس صفت کو نمایاں کیا گیا، وہ ہے "ربّ العالمین" یعنی حمد ہے اللہ کے لئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"۔

اس طرح اللہ کی یاد کے ساتھ فوراً اُس تعلق کی یاد قائم کی گئی جو اُس کا کائنات کے ساتھ ہے۔ اب یہ خطِ محبت جو اللہ تک تک پہونچ کر ختم ہو جاتا، ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ اب منعکس ہوا اور پلٹ کر جو آیا تو آفاقیت لے کر، ہمہ گیری لے کر وسعت لامحدود لے کر، مساوات لے کر اور عالمگیر برادری کا تصور لے کر۔ اب اُس خطِ محبت سے دائرہ بنا جو تمام کائنات پر حاوی ہو گیا۔ اب اس میں یگانہ، و بیگانہ، دیسی اور بدیشی، ہم مذہب۔ کسی تفریق کا سوال نہیں۔ یہاں تک کہ دوست اور دشمن کا بھی امتیاز نہیں۔

اب اس رشتہ کے ماتحت جس تمدن کی بنیاد پڑے گی، اُس میں عدلِ کلی، انصافِ عمومی اور اخوتِ عالمی کے وسیع احاطہ کی تعمیر ہو گی جس کا دائرہ کل خلق پر حاوی ہو گا اب حقوق کی تقسیم مساویانہ ہو گی اور بے لاگ فیصلے

گے جیسا کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو مخاطب کر کے فرمان جاری کر رہا ہے کہ:-

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا

"دیکھو کسی قوم سے دشمنی اس کی باعث نہ ہو جائے کہ تم عدالت سے کام نہ لو۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ ۚ

"اے ایمان والو! عدالت کی ذمہ داری کو پورا کرنے والے اور اللہ کے لئے سچی گواہی دینے والے رہو، چاہے وہ تمہارے خلاف یا ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف بھی ہو"

جو اس نظامِ تمدن کے مثالی نمونہ تھے، اُن کا کردار جو آلٰہی رشتہ کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، اس نظام کی عملی مثال تھا۔

یہاں وہ ہستی جو خود ان کے ساتھ یہ رویہ رکھتی ہو کہ گھر کا کوڑا جمع کیے ہوئے منتظر رہتی ہو کہ یہ اُدھر سے گزریں تو وہ اُس کوڑے کو ان پر پھینک دے جب بیمار پڑتی ہے تو یہ اُس کی عیادت کے لیئے اُس کے گھر جاتے ہیں۔

بیٹی کو ایک خادمہ دیتے ہیں جسے عرفِ عام میں کنیز کہا

جاتا تھا اور اُس بیٹی کی اپنی جگہ یہ عزت ہے کہ باپ ہوتے ہوئے اُس کی تعظیم کو کھڑے ہوتے ہیں مگر ایک کنیز کے لئے اُسے ہدایت ہوتی ہے کہ ایک دن گھر کا کام تم کرنا اور ایک دن اس سے لینا۔

یہاں اپنے خادم کو جو غلام کہلاتا ہے بازار ساتھ لے جاکر دو کرتے خریدے جاتے ہیں تو زیادہ قیمت والا کرتا غلام کو دیا جاتا ہے اور جو کم قیمت کا ہے وہ اپنے لیے رکھا جاتا ہے۔

یہاں تک کہ اس نظام تمدن کا نمونہ دوست و دشمن کی تفریق ختم کرتا ہوا یہ نظر آئے گا کہ حالت جنگ میں فریق مخالف نے پانی بند کر دیا تھا مگر جب خود اس دریا پر قبضہ کرتے ہیں تو ہدایت کر دی جاتی ہے کہ خبردار پانی روکا نہ جائے۔ دریا پر قبضہ ہمارا رہے مگر پانی سب پئیں۔

اور اس سے بھی بڑھا ہوا یہ نمونہ سامنے آتا ہے کہ جس نے سر پر زہر میں بجھی ہوئی تلوار لگائی ہے، وہ قاتل خود اپنے مکان کے ایک حصہ میں بحیثیت قیدی کے رکھا جاتا ہے تو اُس کے ساتھ مہمان کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور گھر والوں کو ہدایت ہو جاتی ہے کہ جو کھانا گھر کے سب آدمی کھائیں وہ اُس کو بھی ملے۔ یہاں تک کہ اُسی زخم کی شدت سے جب حالت

غیر ہوتی ہے اور معالج جواب دے دیتا ہے کہ اب جانبری ممکن نہیں اور اس وقت اس معالج کی ہدایت سے دودھ کا پیالہ لایا جاتا ہے تو بستر پر تکلیف اور کرب و اذیت کے عالم میں تڑپنے کے باوجود وہ دودھ کو نوش کرنے کے بعد ہدایت ہوتی ہے کہ ایسا ہی دودھ کا بھرا ہوا پیالہ اُس قاتل کو بھیجا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس تمدن کے زیر سایہ جب حکومت قائم ہو گی تو اُس میں رعایا کے درمیان تفریق کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا چنانچہ حضرت علی بن ابی طالب اپنے ایک خاص معتمد مالک اشتر کو گورنر بنا کر بھیجتے ہیں تو ہدایت فرما دیتے ہیں کہ:-

ساوبینهم ابا للحظة والنظرة	دیکھ تمام رعایا کو ایک نگاہ سے دیکھنا

یہ رعایا سب مسلمان نہیں ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے:-

لانهم اما اخ لک فی الدین و نظیر لک فی الخلق	وہ یا تو تمھارے دینی بھائی ہیں یا تمھاری ہی طرح اللہ کے مخلوق ہیں۔

پھر اس ذیل میں اُس سوال کا جواب دیتے ہیں جو آج تقریباً ہر ملک کی اقلیت کے سامنے پیش ہوتا ہے کہ تم پر بھروسا کیونکر کیا جائے؟ اس کا جواب آج سے چودہ سو برس پہلے حضرت علیؑ نے اس فرمان میں دیا ہے کہ لیکون ثقتک بھم بمقدار حسن صنیعک بھم تمھارا بھروسا اُن پر اتنا ہونا چاہیے

جتنا تمھارا سلوک اُن سے اچھا ہو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ رعایا سے یہ پوچھنا بے کار ہے کہ تم پر اعتماد کس طرح کریں؟ خود اپنے نفس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہم اُن سے سلوک اچھا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر سلوک اچھا ہوا تو جو ابھی تک غیر وفادار بھی ہوں، نتیجہ میں وفادار ہو جائیں گے۔

یہی وہ نظامِ تمدّن ہے کہ اگر دنیا اس نظام کو عملی طور پر اختیار کرے تو یہ دنیا نہ رہے۔ یہی ایسی جنت ہو جائے جس کا وصف یہ ہو کہ لا خوف علیہم ولا ھم یحزنون ٥ "نہ اُس میں خوف و دہشت کا دور دورہ ہے نہ رنج و ملال"

دنیا کی صحیح نظام کی تلاش میں تگ و دو جو جاری ہے، بہت ممکن ہے کسی وقت تمام دنیا کو اسی نظام کے زیر سایہ لے آئے اس وقت قرآن کا وہ اعلان پورا ہوگا "لیظہرہ علی الدین کلہ" یعنی آخر میں یہ دین غالب آ کر رہے گا۔ یہ غلبہ عسکری غلبہ نہیں جس میں زمینوں پر قبضہ ہوتا ہے مگر دلوں میں نفرت ہوتی ہے بلکہ وہ غلبہ جو احساس حقانیت کا غلبہ ہے، جس کے رگ و ریشے دل و دماغ کی زمین میں پھیلے ہوں اور ضمیر انسانی نے اُس سکون و اطمینان کو حاصل کر لیا ہو جس کے بعد تلاشِ منزل کی بے چینی اور اضطراب نے ختم ہو کر کشتی

کے لئے ساحل اور مسافر کے لئے صحیح منزل کو پا کر مستقل سکون و اطمینان کی شکل اختیار کر لی ہوں۔

علی نقی النقوی

۱۲ / شوال ۱۳۹۳ھ (علی گڑھ)

پبلشر: سید ابن حسین نقوی